© rasailojaraid.com

قدر بلگرامی :

ہوئے میر عمارت نیک دل کرنل ہوشے اس میں (۱۸۷۸ء)

داغ دہلوی :

معتمد صاحب ہوئے ایسا خطاب (۱۳۱۸ھ)

حضوت جلیل :

آٹھ گئے چھ تو بفرمان خداوند جلیل
میر عثمان علی خان ہوئے سلطان دکن (۱۹۱۱ء)

''ہوئی'' کے اعداد کے متعلق ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دونوں جماعتوں کے نظائر سے بحث کی گئی ہے۔ دونوں کا موقف اپنی اپنی جگہ ہر قارئین کرام کو دعوت فکر دیتا ہے۔ وہ حضرات جو ہوئی کے اکیس عدد بھی لیتے ہیں اور اکتیس بھی، اس نتیجہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ فن تاریخ ایک مشکل اور ادق فن ہے ، اس لیے ہوئی اگر ایک ے کتابت ہوگی تو اس کے (۲۱) عدد اور اگر دو (ی) سے ایسے لکھیں گے تو (۳۱) عدد شمار ہوں گے۔ البتہ مولانا صفی لکھنوی کی رائے گرامی رسم الخط کے متعلق جو علمی و فنی معلومات لیے ہوئے ہے اس کی روشنی میں (ہوئی) میں دو تحتانیاں شمار ہوں گی اور اس کے عدد (۳۱) لیے جائیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر مظہر معین*

لغات سامیة کا تحقیقی مطالعہ

''لغات سامیة'' سے مراد کونسی زبانیں ہیں - اس سلسلے میں مشہور ماہر لغات سامیة دکتور اسرائیل ولفنسون لکھتے ہیں :

''تطلق کلمة لغات سامیة علی جملة من اللغات التی کانت شائعة منذ أزمان بعیدة فی بلاد آسیا و افریقیة سواء منها ما عفت آثارها و ما لا یزال باقیاً الی الآن و اول من استعمل هذا الاصطلاح هوالعالم شلوتسر (Shlözer) فی ابحاثه و تحقیقاته فی تاریخ الامم الغابرة سنه ۱۷۸۱ ب. م -''[1]

ترجمہ : کلمة ''لغات سامیة'' کا اطلاق ان جملہ زبانوں پر ہوتا ہے جو دور دراز زمانوں سے ایشیا و افریقہ کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں ، خواہ ان میں سے کچھ کا نام و نشان اب مٹ چکا ہے یا وہ اب تک باقی چلی آتی ہیں - سب سے پہلے جس نے اس اصطلاح کو استعمال کیا وہ عالم شلوذر ہے جس نے ۱۷۸۱ء میں گزشتہ اقوام کی تاریخ کے سلسلے میں اپنی ابحاث و تحقیقات کے ضمن میں ایسا کیا -

دائرة المعارف البریطانیة (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) میں سامی زبانوں کے بارے میں یوں مرقوم ہے :

"The "Semetic Languages" so named in 1781 by the German Historian A. L. Schlözer because most of the people who spoke them were descended from Shem or Sem (Gen. x-xi), were spoken in Arabia, Mesopotamia, Syria and Palestine, from which they spread begining with the first millenium B. C., into Ethiopia and later into Egypt and northern Africa."[2]

ان تحقیقی بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ''لغات سامیة'' وہ زبانیں ہیں جو قدیم

---

* استاذ مساعد (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ عربی، جامعہ پنجاب، لاہور -

۱- اسرائیل ولفسون ، تاریخ اللغات السامیة، ص ۲

2. Encyclopedia Britanica, V. 20, p. 208 (Semetic Languages)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبانوں سے ایشیا و افریقہ کے مختلف علاقوں میں رائج تھیں، خواہ یہ وہ زبانیں ہیں جو اب تک باقی ہیں یا وہ زبانیں جن کا نام و نشان مٹ چکا ہے ، یہ سب سامی زبانیں ہیں ۔ یہ زبانیں سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد بولتی تھی، جس کی بناء پر انہیں سامی زبانوں کا نام دیا گیا اور سب سے پہلے جس محقق نے ان زبانوں کو لغات سامیة کا نام دیا وہ جرمن محقق اے ۔ ایل ۔ شلوتسر ہیں ، جنہوں نے ۱۷۸۱ء میں یہ اصطلاح اس وقت استعمال کی جب وہ گزشتہ اقوام کی تاریخ کے سلسلے میں بحث و تحقیق کر رہے تھے ۔ یہ زبانیں جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا کے بیان سے ظاہر ہے ، جزیرۃ العرب ، عراق ، شام ، فلسطین وغیرہ کے علاقوں میں بولی جاتی تھیں، جہاں سے یہ پہلے ہزار سالہ دور قبل مسیح سے ابتداء کر کے پہلے حبشہ اور بعد ازاں مصر و شمالی افریقہ میں پھیل گئیں ۔

لغات سامیة میں کون سی زبانیں شامل ہیں ، اس سلسلے میں عربی زبان کے حوالے سے جرجی زیدان لکھتے ہیں :

''اللغة العربية هي احدى اللغات السامية ۔ و يريدون باللغات السامية اللغات التي كان يتفاهم بها ابناء سام ۔ وهم في إصطلاحهم ابناء مابين النهرين و جزيرة العرب والشام ۔ اشهرها العربية والسريانية و العبرانية والفينيقية والأشورية والبابلية والحبشية''۱

ترجمہ: عربی زبان لغات سامیہ میں سے ایک ہے اور لغات سامیہ سے اہل علم وہ زبانیں مراد لیتے ہیں جن کے ذریعے فرزندان سام آپس میں ایک دوسرے کی بات سمجھتے سمجھاتے تھے اور وہ لوگ ان کی اصطلاح کے مطابق مابین النہرین ، جزیرۃ العرب اور شام کے باشندے ہیں ۔ ان زبانوں میں سے مشہور ترین عربی، سریانی، عبرانی، فینیقی ، اشوری، بابلی اور حبشی ہیں ۔

احمد حسن زیات عربی اور دیگر سامی زبانوں کی اصل مشترک اور پھر مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے مستقل بالذات زبانیں بن جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اللغة العربية احدى اللغات السامية انشعبت هي و هن من أدومة واحدة نبتت في أرض واحدة فلما خرج الساميون من مهدهم لتكاثر عددهم اختلفت لغتهم الأولى بالاشتقاق والاختلاط و زاد هذا الاختلاف انقطاع الصلة و تاثير البيئة و تراخي الزمن حتى أصبحت كل لهجة منها لغة مستقلة ۔''۲

۱۔ جرجی زیدان ، تاریخ آداب اللغة العربية ، ۳۷/۱

۲۔ احمد حسن الزیات ، تاریخ الادب العربی ، ص ۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ: عربی زبان سامی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ اور وہ سب ایک ہی شجرہ سے نکلی ہیں جو ایک ہی مشترکہ سرزمین کی پیداوار ہے۔ پس جب سامی لوگ اپنے وطن سے تعداد زیادہ ہوجانے کی وجہ سے باہر نکلے تو ان کی اولین زبان میں اشتقاق و اختلاط کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوگئے اور ان اختلافات کو رابطہ منقطع ہو جانے، ماحول کے اثرات نیز گردش زمانہ نے بڑھا دیا۔ یہاں تک کہ ہر لہجہ مستقل بالذات زبان کی صورت اختیار کر گیا۔

سب سے پہلے علمائے یہود نے قرون وسطی میں سامی زبانوں کے تعلق باہم کو محسوس کیا:

"و يقال ان أحبار اليهود هم أول من فطن الى مابين اللغات السامية من علاقة و تشابه أثناء القرون الوسيطة و لكن علماء المشرقيات من الاوروبيين هم الذين أثبتوا هذه العلاقة بالنصوص حتى جعلوها حقيقة علمية لا ابهام فيها و لا شك۔"[1]

ترجمہ: کہا جاتا ہے کہ علمائے یہود نے سب سے پہلے قرون وسطی میں اس تعلق و مشابہت کو دریافت کیا جو سامی زبانوں کے مابین پائی جاتی ہے۔ لیکن یورپ کے ماہرین علوم شرقیہ ہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس تعلق کو نصوص کے ساتھ ثابت کیا، یہاں تک کہ اسے ایک ایسی علمی حقیقت بنا دیا جس میں کوئی شک اور ابہام نہیں۔

یہی بات اسرائیل ولفنسون نے بھی لکھی ہے:

"و أول من تنبه الى هذه العلاقة التي بين الأمم السامية هم علماء اليهود الذين كانوا في اندلس في القرون الوسطى ثم جاء المستشرقون بعدهم فأخذوا يبحثون في علم اللغات السامية بعناية و توسع حتى وضحت هذه العلاقة وضوحاً قاماً۔"[2]

ترجمہ: سب سے پہلے جس نے سامی اقوام کے مابین پائے جانے والے اس تعلق کو محسوس کیا وہ قرون وسطی میں اندلس کے یہودی علماء تھے۔ پھر ان کے بعد مستشرقین کا دور آیا۔ چنانچہ انہوں نے سامی زبانوں کے علم کے سلسلے میں پوری توجہ اور تفصیل سے تحقیقات کیں۔ یہاں تک کہ یہ تعلق پوری طرح واضح ہوگیا۔

۱۔ احمد حسن الزیات، تاریخ الادب العربی، ص ۱۳

۲۔ اسرائیل ولفنسون، تاریخ اللغات السامیۃ، ص ۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلپ کے حتی ان زبانوں کے تعلق باہم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "With the decipherment of the cuneiform writing in the middle of the nineteenth century and the comparative study of the Assyro-Babylonian, Hebrew, Aramaic, Arabic and Ethiopic tongues, it was found that those languages have striking points of similarity and were, therefore cognates".[1]

چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں خط پیکانی یا میخی کو سمجھ لیے جانے اور اشوری ، بابلی ، عبرانی ، آرامی ، عربی اور حبشی زبانوں کے تقابلی مطالعہ کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ ان زبانوں کے مابین گہری مشابہت کے نکات پائے جاتے ہیں ۔ لہذا یہ تمام زبانیں مشترک الاصل ہیں ۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ سامیۃ اصلیۃ یا اصل سامی زبان کون سی تھی جس سے یہ تمام زبانیں نکلیں ۔ اس بارے میں دائرۃ المعارف البریطانیۃ کا بیان یوں ہے :

> "The Semetic Languages go back to Proto-Semetic Language the general structure of which can be derived from the historically attested features of the various Semetic Languages. In all probability Proto-Semetic was at no time a unified language, but had dialectical variants."[2]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لغات سامیۃ کی اساس وہ سامیہ اصلیہ ہے جس کا عمومی ڈھانچہ مختلف سامی زبانوں کے تاریخی طور پر مسلمہ خصائص سے اخذ کیا جا سکتا ہے ۔ تاہم تمام تر امکان اس بات کا ہے کہ سامیہ اصلیہ کسی دور میں بھی ایک متحدہ زبان نہیں رہی ہو گی ۔ بلکہ ابتدا ہی سے مختلف بولیوں کی حامل تھی۔

المهد الاصلی للامم السامية

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ سامی زبانوں سے کونسی زبانیں مراد ہیں اور ان زبانوں کے باہم تعلق کی نوعیت کیا ہے ۔ نیز اگر یہ باہم مشابہ و مشترک الاصل ہیں تو سامیۃ اصلیۃ کون سی تھی ۔ یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ان زبانوں کا وطن اصلی کونسا تھا، جہاں سے نکل کر مختلف علاقوں میں اس زبان کی مختلف بولیاں پھیلیں ۔

بقول اسرائیل ولفنسون :

---

1. Hitti, History of the Arabs, p. 9
2. Encyclopedia Britanica, V. 20, p. 208

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"و اذا فرضنا صحة الرای القائل بأنه كان لجميع الأمم السامية موطن واحد و مهد اصلی نشأت كلها فيه ثم تفرعت عنه وانتشرت فی أنحاء المعمورة فأين كان هذا الموطن الاصلی ۔"[1]

ترجمہ: اگر ہم اس رائے کی صحت کو تسلیم کر لیں جس کے مطابق تمام امم سامیہ کا ایک وطن مشترک اور مہد اصلی تھا جس میں یہ سب پروان چڑھیں پھر اس سے یہ متفرق شاخیں بن کر جدا ہوئیں اور اطراف معمورۃ میں پھیل گئیں تو پھر یہ وطن اصلی کہاں تھا۔

مشہور مستشرق نکلسن نے اس سلسلے میں درج ذیل بیان دیا ہے:

"Whether the original homeland of the undivided Semitic race was some part of Asia (Arabia, Armenia, or the district of the lower Euphrates, or whether, according to a view which has lately found favour, the Semites crossed into Asia from Africa is still uncertain."[2]

امم سامیہ کے وطن اصلی کا سوال اٹھاتے ہوئے فلپ کے حتی نے بڑے قیمتی نکات اٹھائے ہیں اور اس حوالے سے جزیرۃ العرب کے وطن اول ہونے کے نظریے کو بقیہ تمام نظریات کے مقابلے میں زیادہ وزنی قرار دیا ہے:

"Where was the original home land of this people ? Different hypothesis have been worked out by various scholars. There are those who considering the broad ethnic relationship between Semities and Hemites, hold that eastern Africa was the original homeland, others influenced by the Old Testment tradition, maintain that Mesopotamia provided the first abode, but the arguments in favour of the Arabian Peninsula considered in its cumulative effect, seen most plausible."[3]

چنانچہ حتی کے بیان کے مطابق مختلف اہل علم و تحقیق کے دلائل کی رو سے مشرق افریقہ، عراق یا جزیرۃ العرب کے وطن اصلی ہونے کا زیادہ امکان ہے اور حتی کی ذاتی رائے میں جزیرۃ العرب کے حق میں دلائل اپنے مجموعی تأثر کے لحاظ سے بظاہر معقول تر نظر آتے ہیں جبکہ دوسرے مقامات کے سلسلے میں عقلی لحاظ سے

۱۔ اسرائیل ولفنسون، تاریخ اللغات السامیة، ص ۴

2. Nicholson, R.A., A Literary History of the Arabs, p. xv ; Hitti, History of the Arabs, p. 10.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعض الجھاؤ موجود ہیں مثلاً میسوپوٹیمیا والا نظریہ اس لیے کمزور ہے کہ اس کے مطابق یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ ایک دریا کے کناروں پر ترقی کی زرعی سٹیج سے گزرنے والے باشندے الٹا بدویانہ سٹیج کی طرف جا رہے ہیں جبکہ یہ بات تاریخی ادوار میں قانون اجتماعی یا معاشرتی قانون کے برعکس ہے - اسی طرح افریقہ والا نظریہ بھی حتی کی رائے میں زیادہ قابل قبول نہیں :

> "The Mesopotamian theory is vitiated by the fact that it assumes passage of people from an agricultural stage of development on the banks of a river to nomadic stage, which is reverse of the socialogical law in thé historical times. The African theory raises more questions than it answers."[1]

فلپ کے حتی جیسے مسیحی مؤرخین و مستشرقین کے علاوہ اسرائیل ولفنسون جیسے یہودی علماء و ماہرین لغات سامیہ نے بھی جزیرۃ العرب کے امم سامیہ کا وطن اول ہونے کے نظریے کو ترجیح دی ہے اور اس کے حق میں دلائل فراہم کیے ہیں - یہ ذکر کرنے کے بعد کہ اس نازک مسئلہ پر تمام تر کوششوں کے باوجود علمائے مستشرقین کے مابین بڑا اختلاف واقع ہوا ہے - اس اختلاف کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"فبعضهم يزعم أن المهد الاصلی للساميين انما هو أرض أرمينية بالقرب من حدود كردستان و بعضهم يقول ان هذا المنطقة هی المهد الأصلی لأمم السامية و للأمم الآرية جميعاً ثم تفرعت منها جموع البشر فی ارض الله الواسعة -"[2]

ترجمہ : ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ سامیوں کا مہد اصلی حدود کردستان کے قریب آرمینیہ کی سرزمین ہے اور بقول بعض یہ منطقۃ سامی و آریائی اقوام سب کا وطن اصلی ہے - پھر اس سے انسانوں کے گروہ نکل کر خدا کی وسیع سرزمین میں پھیلے -

توراۃ کے مطابق بنو نوح کی آباد کردہ قدیم ترین سرزمین ارض بابل تھی :

"و للتوراة نظرية خاصة عن أقدم ناحية عمرها بنو نوح و هی ارض بابل و قد تكون هذه النظرية اقرب الی الحقيقة فقد أثبتت البحوث التاريخية أن أرض

---

1. Hitti, History of the Arabs, p. 10.

۲- اسرائیل و لفنسون ، تاریخ اللغات السامیۃ ، ص ۴ بحوالہ : (Th. Noeldeke : Sem Sprachen, p. 12).

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بابل هی المهد الاصلی للحضارة السامیة ـ''۱

ترجمہ : بنو نوح نے جس قدیم ترین گوشہ زمین کو آباد کیا ، اس کے بارے میں توراۃ کا ایک خاص نظریہ ہے کہ وہ ارض بابل ہے اور یہ نظریہ حقیقت سے قریب تر ہو سکتا ہے ، کیونکہ تاریخی تحقیقات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ارض بابل ہی سامی تہذیب کا مسکن اصلی ہے ۔

مشہور مستشرق جویدی (Guidi) نے دریائے فرات کے کنارے جنوبی عراق کے گرد و نواح میں سامی اقوام کا مسکن اول ہونے کے نظریے کی تائید کی ہے اور اس ضمن میں کئی مشترکہ کلمات کا بھی حوالہ دیا ہے :

''و قد أیدالعالم جویدی هذه النظریة فی رسالة یقول فیها ان المهد الاصلی للأمم السامیة کان فی نواحی جنوب العراق علی نهر الفرات و قد سرد عدداً من الکلمات المألوفة فی جمیع اللغات السامیة عن العمران والحیوان والنبات و قال ان أول من استعمله هم أمم تلک المنطقة ثم أخذها عنهم جمیع السامیین ـ''۲

ترجمہ : عالم جویدی نے ایک رسالہ میں اس نظریہ کی تائید کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ امم سامیہ کا مہد اصلی جنوبی عراق کے گرد و نواح میں دریائے فرات کے کنارے تھا ۔ انہوں نے بود و باش ، حیوانات ، نباتات وغیرہ کے بارے میں کئی ایک ایسے کلمات پیش کیے ہیں جو تمام سامی زبانوں میں مانوس و معروف ہیں ان کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے اس منطقہ کی قوموں نے ان کلمات کو استعمال کیا پھر ان سے تمام سامیوں نے انہیں اخذ کیا ۔

مگر نولدکہ (Noeldeke) نے جویدی پر سخت اعتراض کیا ہے ۔ اس کے بقول :

''ان من العبث أن نعتمد فی اثبات حقیقة کهذه علی جملة کلمات لیس ما یثبت لنا أن جمیع السامیین أخذوها عن أهل العراق ثم یذهب فی تایید معارفته الی سرد بعض کلمات عن الحیوان والعمران کانت و لا شک عند جمیع الامم السامیة من أقدم الازمنة مثل جبل و صبی و خیمة و شیخ و أسود و ضرب فهذه المعانی تختلف تسمیتها فکل لغة سامیة منها تسمیها باسم یغایر الاسم الذی تطلقه علیه اللغة الاخری مع أنها أجدر المعانی بأن یکون لها لفظ مشترک فی کل اللغات السامیة لانها کانت موجودة عندالجمیع حین کانوا أمة واحدة و حین تفرقوا

۱۔ اسرائیل ولفنسون ، تاریخ اللغات السامیة ، ص ۴

۲۔ أیضاً ، ص ۵ بحوالہ (T. Guidi : Della Sede deipopli sem)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

أسماً شتیٰ ۔''۱

ترجمہ : اس قسم کی حقیقت کے اثبات کے لیے یہ بات عبث ہے کہ ہم کچھ ایسے کلمات پر اعتماد کریں جن کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ تمام سامی لوگوں نے انہیں اہل عراق سے حاصل کیا پھر وہ اپنے اعتراض کی تائید میں حیوانات اور بود و باش کے بارے میں بعض ایسے کلمات پیش کرتا ہے جو بلاشک قدیم زمانوں سے تمام سامی اقوام کے ہاں موجود تھے مثلاً پہاڑ ، بچہ ، خیمہ ، شیخ ، سیاہ ، ضرب وغیرہ ۔ پس معانی پر مشتمل الفاظ و اسماء مختلف زبانوں میں مختلف ہیں ۔ ان میں سے ہر سامی زبان انہیں ایسے ناموں سے موسوم کرتی ہے جو دوسری زبان میں موجود اسماء سے مختلف ہیں حالانکہ یہ معانی اس بات کے سب سے زیادہ سزاوار تھے کہ ان کے لیے تمام سامی زبانوں میں مشترکہ الفاظ ہوتے کیونکہ یہ چیزیں اس وقت بھی سب کے ہاں موجود تھیں جب وہ ایک قوم تھے اور جس وقت وہ مختلف اقوام کی صورت میں متفرق ہوئے ۔

اس کے بعد اسرائیل ولفنسون وطن اصلی کی بحث کو سمیٹتے ہوئے جزیرۃالعرب کے ممکنہ وطن اصلی ہونے کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں :

''من کل هذا یتبین أن من العسیر أن نجزم برأی فی المهد الأصلی لأمم السامیة والذی یمکننا أن نجزم به هو أن أکثر الحرکات و الهجرات عند أغلب الأمم السامیة التی علمنا أخبارها و أسماءها کانت من نزوح جموع سامیة من أرض الجزیرة الی البلدان المعمورة الدانیة والقاصیة فی عصور مختلفة ۔''۲

ترجمہ : ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ بات بہت مشکل ہے کہ ہم امم سامیہ کے مہد اصلی کے بارے میں کوئی ایک قطعی رائے اختیار کریں ۔ جو بات ہمارے لیے قطعیت کے ساتھ کہنا ممکن ہے وہ یہ کہ امم سامیہ کے ہاں اکثر تحریکیں اور نقل مکانیاں جن کے حالات اور اسماء سے ہم واقف ہیں ، وہ سامی گروہوں کے جزیرۃ العرب کی سرزمین سے نکل کر مختلف زمانوں میں آباد دنیا کے قریب و بعید کے ممالک کی جانب جانے پر مبنی تھیں ۔

---

۱ - اسرائیل ولفنسون ، تاریخ اللغات السامیة ، ص ۵ بحوالہ (Noeldeke : Sem sprachen p. 14)

۲ - ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے بعد اسرائیل ولفنسون کے تفصیلی بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم ترین ہجرت سامیہ بھی جزیرۃ العرب سے بابل کی جانب ہوئی اور ان گروہوں نے فرات کے علاقے میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی ، اسی طرح کنعانی و آرامی قبائل نے بھی بلاد العرب سے نقل مکانی کی ۔ پھر بنی اسرائیل کی نقل مکانی جس کے نتیجے میں فتح فلسطین ہوئی ، جزیرۃ العرب ہی شروع ہوئی تھی اور اس فتح نے دینی و معاشرتی تغیرات کے سلسلے میں تاریخ عالم پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا ۔ پھر یہ نقل مکانیاں عراق ، سوریا اور فلسطین سے تجاوز کرکے مصر تک جا پہنچیں اور سامی قبائل نے بلاد النیل تک پہنچ کر مصر تک اپنا اقتدار پھیلا لیا اور مصر کی تاریخ میں ان حکمران خاندانوں کا دور آیا جو ”ھکسوس“ کے نام سے معروف ہیں ۔ اسی طرح ظہور اسلام کے بعد جزیرۃ العرب سے عالم قدیم کے تمام اطراف و اکناف کی جانب ہونے والی نقل مکانی وہ آخری عظیم سامی لہر ہے جس نے ایشیا ، افریقہ اور یورپ کی بہت سی اقوام کے احوال میں تغیر برپا کر دیا اور سیاسی ، دینی ، اجتماعی اور عمرانی تمام دائرہ ہائے حیات میں انقلاب برپا کر دیا ۔ بلکہ آج تک صحرائی علاقوں سے قریب و بعید کے شہروں اور ملکوں کی جانب نقل مکانی کا سلسلہ اپنے تمام تر شدید خطرات اور عظیم نتائج و عواقب کے ہمراہ جاری ہے ۔[1]

تاہم اسرائیل ولفنسون اور دیگر ماہرین لغات سامیہ کے رائے میں تمام تر امکانات کے باوجود حتمی طور پر یہ کہنا ممکن نہیں کہ جزیرۃ عربیۃ ہی امم سامیہ کا مہد اصلی ہے ۔ البتہ اس بات کی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ امم سامیۃ جزیرۃ العرب کی لغات و لہجات سے کافی متأثر ہوئیں :

”علی أن هذا كله لا يدل يقيناً علی أن الجزيرة العربية كانت هی المهد الاصلی للامم السامية فانه من المتحمل مع هذا كله ان يكون موطن الأمم السامية الاول فی منطقة أخری غير المناطق السامية المعروفة ۔ و كل ما تدل عليه تلك العلاقة المتينة بين الهجرات السامية و الجزيرة العربية انما هو تأثر هذه الامم السامية بلغات الجزيرة العربية ۔“[2]

ترجمہ : تاہم یہ سب یقینی طور پر اس بات کی دلیل نہیں کہ جزیرۃ العرب ہی امم سامیہ کا مہد اصلی تھا اور ان تمام دلائل و نکات کے باوجود اس بات

۱۔ راجع اسرائیل و لفنسون ، تاریخ اللغات السامیۃ ، ص ۵ - ٦

۲۔ ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا احتمال موجود ہے کہ امم سامیہ کا وطن اول معروف سامی منطقوں کے علاوہ کسی اور خطہ میں ہو ۔ زیادہ سے زیادہ سامی اقوام کی نقل مکانیوں اور جزیرۃ العرب کے مابین مضبوط اور گہرا رشتہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سامی اقوام جزیرۃ العرب کی لغات سے متأثر ہوئیں ۔

لغات سامیہ کی تعریف متعین ہو جانے اور امم سامیہ کے مہد اصلی کی تفصیلی بحث کے نتیجے میں مجموعی دلائل کی رو سے جزیرۃ العرب کے وطن اول ہونے کے غالب تر امکان کے بعد یہ سوال بھی انتہائی اہم ہے کہ امم سامیہ کے مابین وہ کون سے خصائص پائے جاتے ہیں جن کی بناء پر انھیں مشترک الاصل یا مماثل زبانیں قرار دیا جا سکتا ہے ۔

خصائص اللغات السامیة

لغات سامیة کی امتیازی علامات و خصائص کے سلسلے میں مختلف علمی مراجع و مصادر کے تفصیلی مطالعہ اور تحقیق و تجزیہ کے نتیجے میں درج ذیل اہم نکات سامنے آتے ہیں :[1]

۱۔ لغات سامیة بنیادی طور پر صرف حروف صحیحہ (Consonants) پر انحصار کرتی ہیں اور حروف علت یا اصوات (Vowels) کی جانب ان کا نسبتاً بہت کم التفات ہے ۔ چنانچہ حروف کے درمیان بالعموم علامات اصوات نہیں پائی جاتیں ۔ جبکہ آریائی زبانوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ البتہ سامی زبانوں میں تفخیم ، تضخیم ، ترقیق ، ابراز الاسنان اور ضغط علی الحق وغیرہ کے حوالے سے مختلف حروف پائے جاتے ہیں جو آریائی زبانوں کے مقابلے میں بڑی انفرادیت کے حامل ہیں ۔

۲۔ کلمات کی غالب تعداد کا اشتقاق سہ حرفی اصل سے ہوتا ہے (بعض صورتوں میں دو حرفی) ۔ یہ اصل فعل ہے جس کی ابتداء یا آخر میں ایک یا زائد حروف کا اضافہ کرنے سے کلمہ واحدۃ سے مختلف صورتیں بن جاتی ہیں جو مختلف معانی کی حامل ہوتی ہیں ۔

۳۔ لغات سامیة میں ادغام کلمة کا کوئی ایسا اثر نہیں پایا جاتا جس سے دو کلمے مل کر کلمة واحدة بن جائیں اور کسی ایسے مرکب معنی کی نشاندہی کریں

۱۔ راجع للتفصیل اسرائیل ولفنسون ، تاریخ اللغات السامیة ، ص ۱۴ - ۱۷ بعد و دائرۃ المعارف البریطانیة ، مجلد ۲ ، ص ۲۰۸ و مابعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو دونوں الگ الگ کلموں میں پائے جانے والے معنی پر مبنی ہوں - جیسا کہ غیر سامی لغات کا معاملہ ہے - عربی زبان میں ظہور اعراب کا یہی سبب ہے اور بقیہ سامی زبانوں مثلاً عبرانی ، سریانی اور بابلی وغیرہ میں بھی اعراب کی باقیماندہ علامات دیکھی جا سکتی ہیں -

۴- لغات سامیہ میں جنس کی تذکیر و تانیث کا واضح امتیاز موجود ہے اور مذکر و مؤنث کے لیے الگ ضمائر و الفاظ استعمال ہوتے ہیں - مثلاً عربی میں مؤنث بنانے کے لیے عام طور پر مذکر کے آخر میں تائے تانیث کا اضافہ کر دیا جاتا ہے - مثلاً ''مسلم'' سے ''مسلمة''، ''سید'' سے ''سیدة''، ''عالم'' سے ''عالمة'' وغیرہ - تاہم بعض مخصوص اسماء بغیر تائے تانیث بھی مؤنث شمار کیے جاتے ہیں - مثلاً جسم کے بعض اعضاء ''ید''، ''عین'' وغیرہ اور بعض جغرافیائی اصطلاحات مثلاً ''ارض''، ''مصر'' نیز ''شمس'' وغیرہ - بعض الفاظ جو مؤنث کے لیے بولے جاتے ہیں وہ تائے تانیث سے خالی ہوتے ہیں مثلاً ''أم'' -

۵- سامی زبانوں کی ایک اور اہم خصوصیت صیغہ تثنیة کا استعمال ہے - دائرة المعارف البریطالیہ کے مطابق سامیة اصلیة میں واحد ، تثنیہ اور جمع تین صیغے استعمال ہوتے تھے - تثنیہ کا صیغہ ابتداء میں جسم کے ان اعضاء کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو جوڑا جوڑا ہیں - مثلاً عربی میں ''یدان''، ''اذنان''، ''رجلان'' وغیرہ - لیز عربی کے علاوہ اب بھی عبرانی اور اکادمی وغیرہ زبانوں میں تثنیة کا صیغہ مستعمل ہے - لثنیة کے علاوہ سامی زبانوں میں جمع کا صیغہ بھی دو قسم کا ہوتا ہے مثلاً عربی میں جمع سالم و مکسر - جمع مکسر اب بھی عربی اور شمالی حبشی میں مستعمل ہے - بعض دیگر سامی زبانوں میں بھی اس کی باقیماندہ علامات ملتی ہیں -

۶- السنة سامیة میں اعداد کی تذکیر و تانیث کا فرق بھی موجود ہے جبکہ آریائی اور دیگر زبانوں میں ایسی صورت نہیں پائی جاتی مثلاً عربی میں ''ثلاثة''، ''اربعة''، ''خمسة'' وغیرہ کے مقابل ''ثلاث''، ''اربع''، ''خمس'' وغیرہ - نیز ایک منفرد بات یہ ہے کہ مذکورہ اسماء کے ساتھ بظاہر مؤنث اعداد اور مؤنث کے ساتھ بظاہر مذکر اعداد استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً عبرانی میں ''اربعہ احیم'' (arba'a ah-im) یعنی چار بھائی اور اربع احیوت (arbà ahayot) یعنی چار بہنیں - یہی معاملہ عربی کا ہے مثلاً اربعة اخوان (چار بھائی) اور اربع اخوات (چار بہنیں) -

۷- سامی زبانوں کے تفصیلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان زبانوں کی اصل مشترک یا سامیة اصلیة میں ماضی ، حال اور مستقبل کے حوالے سے زمانوں کی تقسیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجود نہ تھی ۔ کسی کام کے متعلق اظہار خیال کے لیے دو ہی پیرائے تھے :

۱۔ مکمل عمل ۔

۲۔ نامکمل عمل ۔

یہ صورت حال بعد کے زمانے میں پیدا ہوئی کہ کام کی تکمیل شدہ حالت ماضی قرار پائی اور نامکمل حالت حال یا مستقبل کی علامت بن گئی ۔ تعداد اور تذکیر و تانیث کے اظہار کے لیے بالعموم تکمیل شدہ عمل میں لاحقوں اور نامکمل عمل کے ساتھ سابقوں اور لاحقوں کا اضافہ کیا جاتا تھا ۔ مثلاً آج بھی عربی میں ذھب، ذھبتا، ذھبتم (مکمل عمل یا ماضی) ؛ تذھب ، تذھبان ، تذھبون (نامکمل عمل یا مضارع) ۔
تاہم اکادی زبان کی مثال اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں مکمل اور نامکمل ہر دو عملوں کے اظہار کے لیے صرف سابقوں کا اضافہ کیا جاتا تھا ۔

۸۔ دائرۃ المعارف البریطالیۃ کے بیان کے مطابق سامیۃ اصلیۃ یعنی السنۃ سامیۃ کی اصل مشترک میں غالباً کوئی مقررہ حرف تعریف نہ تھا اور بعد ازاں مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف سامی زبانوں میں اس کا اضافہ ہوا ۔ مثلاً عبرانی ”ھا“ (یا ھل) ، عربی میں ”ال“ اور آرامی ”a“ بطور لاحقہ ۔ اکادی زبان میں کوئی مقررہ حرف تعریف موجود نہیں ۔ اسی طرح اشوری ، بابلی اور حبشی زبانوں میں مطلقاً کوئی علامت تعریف نہیں پائی جاتی ۔

۹۔ سامیۃ اصلیۃ میں دائرۃ المعارف البریطانیۃ کے بیان کے مطابق اسم کی تین حالتیں پائی گئی ہیں ۔

(۱) حالت فاعلی یا رفعی

(۲) حالت مفعولی یا نصبی اور حالت اضافی یا جری

(Nominative, Accusative and Genitive Case)

جمع کے صیغوں میں بھی یہ مختلف صورتیں (Case endings) تلاش کی جا سکتی ہیں ۔ کلاسیکل عربی میں یہ صورتیں اب بھی محفوظ ہیں ۔ نیز اکادی زبان کے بعض مدارج میں بھی اپنی کامل شکل میں محفوظ ہیں ۔ تاہم باقی سامی زبانوں میں محض ان کے باقیماندہ آثار ہی تلاش کیے جا سکتے ہیں ۔

(۱۰) لغات سامیۃ میں فعل کی ایک اور اہم خصوصیت ابواب مشتقۃ کی تکوین ہے جو اصل معنی کی ترمیم شدہ یا تبدیل شدہ مختلف اشکال کو ظاہر کرتے ہیں ۔ عربی میں یہ نظام اپنی کامل شکل میں اب تک موجود ہے ۔ یہ ابواب مختلف صورتوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے وجود میں آتے ہیں ۔ مثلاً

(ا) محض صوتی تبدیلی کے ذریعے مثلاً عربی میں قَتَلَ (اس نے قتل کیا) سے قَاْتَلَ (اس نے لڑائی کی) ۔

(ب) حرف ثانی کو مکرر لانے سے مثلاً قَتَلَ سے قَتَّلَ (اس نے خوب اچھی طرح قتل کیا) ۔

(ج) چند سابقے لگانے سے مثلاً نَصَرَ (اس نے مدد کی) سے إِسْتَنْصَرَ (اس نے مدد مانگی) وغیرہ ۔

ابواب مشتقة کی تکوین کے معاملے میں مختلف سامی زبانوں میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے اور لغات سامیة کی اصل مشترک کے حوالے سے کوئی ایک بنیادی نمونہ مہیا کرنا ممکن نہیں ، تاہم اندازے اور وضاحت کے لیے عربی زبان سے مدد لی جا سکتی ہے ۔ اگرچہ اسے سامیة اصلیة کے عمومی ڈھانچہ کی کامل نمائندہ نہیں سمجھنا چاہیے ۔

(۱۱) سامی زبانیں بالعموم دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہیں ۔ مثلاً عربی ، عبرانی وغیرہ ، جبکہ غیر سامی زبانیں مثلاً آریائی زبانیں (سنسکرت ، ہندی وغیرہ) اور رومانوی زبانیں (لاطینی ، انگریزی ، فرانسیسی ، جرمن ، ہسپانوی وغیرہ) بائیں سے دائیں طرف لکھی جاتی ہیں ۔

(۱۲) لغات سامیة کو استعمال کرنے والی اقوام میں قدیم اسالیب تحریر کی پابندی و حفاظت کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے اور تغیر و تبدل کی طرف میلان نسبتاً کم ہے ۔

(۱۳) لغات سامیة میں بہت سے الفاظ مشترک یا مماثل پائے جاتے ہیں جن سے ان کے باہم تعلق اور مشترک الاصل ہونے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً

عربی	اشوری بابلی	عبری	آرامی	لغات جنوب الجزیرة والحبشة
أَبٌ	أَبُو	آب	أبا	أب
أَخٌ	أَخُو	أَح	أْحا	أْحُو
أَرْبَعٌ	أَرْبَعُو	أَرْبَع	أَرْبَع	أَرْبَع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عربى	اشورى بابلى	عبرى	آرامى	لغات جنوب الجزيرة والحبشة
أُمٌّ	أُمُّو	أُم	أُمّا	أُمّ
بِنْتٌ	بِنْتُو	بَت	بَرْتَا	بِنت
جَمَلٌ	جملو	جَمَل	جَمْلا	جَمل
دَمٌ	دَمُو	دَم	دْمَا	د م
سَأَلَ يَسْأَلُ	إِشْأَل	شَأَلْ يِشْأَل	شْأَل	سا ل
شَمْسٌ	شَمْشُو	شَمْش	شِمْشَا	شمس
صَرَخَ	صرخ	صَرَح	صْرَخ	صرخ
عَقْرَبٌ	عَقْرَبُو	عقرب	عقربا	عَقْرب
قَرْنٌ	قَرْنُو	قَرن	قَرْنَا	قَرْن
كَلْبٌ	كَلْبُو	كَلْب	كَلْبَا	كَلْب
كَوْكَبٌ	كاكبُو	كَوكَب	كَوكْبَا	كوكَب
مَاءٌ	مُو	مايم	مَايَا	مَاى
مَوْتٌ	مُوتُو	مَوت	مَوْتَا	مَوت
وَرَقٌ	وَرْقُو	يرق يَرَق	يَرْقا	وَرق
وَلَدَ يَلِدُ	وُلِد	يَلَدْ يَلِد	إِيلَدْ نيلَد	وَلَد يلد
يَدٌ	إِدُو	يَدْ	إِيدَا	أَذْ
يَوْمٌ	أُمُو	يوم	يَومَا	يوم[1]

١- راجع اسرائيل ولفنسون ، تاريخ اللغات السامية ، ص ٢٨٣ - ٢٩٤ وبعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جغرافیائی لحاظ سے لغات سامیۃ تین منطقوں میں منقسم ہیں ۔ یعنی شرقیۃ و فیھا اللغۃ البابلیۃ الاشوریۃ. و غربیۃ و تشمل علی الکنعانیۃ والعبریۃ والآرامیۃ . و جنوبیۃ و فیھا اللھجات العربیۃ فی جمیع بلدان الجزیرۃ العربیۃ واللھجات الحبشیۃ.[1]

تاہم بعض مستشرقین نے منطقۃ شرقیۃ و غربیۃ کو ایک ہی منطقۃ کبریٰ قرار دیتے ہوئے اس کی زبانوں کو ''الکتلۃ الشمالیۃ'' یا شمالی گروپ کا نام دیا ہے اور اس کے بالمقابل منطقۃ ثالثۃ کے لھجات کو ''الکتلۃ الجنوبیۃ'' یا جنوبی گروپ کا نام دیا ہے[2]۔

ان لغات سامیہ کے علاوہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ماضی میں کئی اور سامی زبانیں بھی تھیں جو مفقود ہوگئیں اور ان کے تمام آثار عصور تاریخیہ سے پہلے اور بعد ضائع ہوگئے ۔ اس سلسلے میں اسرائیل کا کہنا ہے :

''ھناک من العلماء من یعتقد أن اللغات السامیۃ کانت فی الأزمان الغابرۃ منتشرۃ فی بلاد یشھد العلم الآن أنھا من مواطن الأقوام الآریۃ فقد قیل ان آسیا الصغریٰ و بعض مناطق بلقان و بعض جزر البحر الأبیض المتوسط کانت فی بادی امرھا مأھولۃ بأرھاط سامیۃ ۔''[3]

ترجمہ : بعض اہل علم ایسے بھی ہیں جن کی رائے کے مطابق لغات سامیۃ گزشتہ زمانوں میں ان ممالک میں پھیلی ہوئی تھیں جن کے بارے میں اب اس بات کی علمی گواہی موجود ہے کہ وہ آریائی اقوام کے اوطان میں سے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایشیائے کوچک ، بعض بلقانی علاقے اور بحر ابیض متوسط کے بعض جزیرے ابتدائے امر میں سامی گروہوں سے آباد تھے ۔

لغات سامیہ کی تعریف و تعیین ، امم سامیۃ کے مہد اصلی کی تفصیلی بحث اور السنہ سامیۃ کے خصائص و ممیزات کی تحقیق کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان زبانوں میں سے کون سی زبان اب تک مسلسل زندہ اور سامی تحقیقات کے لیے اہم ترین وسیلہ ہے ۔ اس سلسلے میں مشہور مستشرق ایچ ۔ اے ۔ آر کب کا درج ذیل بیان اہم اور قیمتی ہے جس میں انہوں نے عربی کا خصوصی تذکرہ کیا ہے ۔ نیز عصر جدید میں عبرانی کے احیاء کی کوششوں کی جانب اشارہ کیا ہے :

۱۔ راجع اسرائیل ولفنسون ، تاریخ اللغات السامیۃ ، ص ۲۰

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً ، ص ۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"The ancient languages of South-western Asia, of which Arabic is the youngest and, except for some small remnants and the modern revival of Hebrew, the only living representative, from a well-defined and independent family, known as the Semitic language-group. They are all closely interrelated and present such remarkable affinities in vocabulary and structure that they evidently posses a common origin."[1]

یہ بیان لغات سامیہ کے مابین عربی زبان کی منفرد حیثیت اور خصوصی لغوی اہمیت کے سلسلے میں بڑا اہم اور بطور مثال کفایت کرتا ہے - عربی کے علاوہ فلسطین پر یہودیوں کے قبضہ اور "اسرائیل" کے قیام کے بعد عبرانی زبان کو سرکاری، قومی اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے ایک زندہ زبان کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے مگر عبرانی زبان صدیوں تک مردہ زبان رہی ہے اور زوال و انحطاط کے طویل و متفرق ادوار سے گزری ہے - اگر یہ توراۃ کی زبان نہ ہوتی تو شاید اس کا بچا کھچا وجود بھی مٹ چکا ہوتا، تاہم عربی کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے زوال و انحطاط کے ادوار کے باوجود ایک مسلسل زندہ زبان کی حیثیت سے جو علمی، دینی، ثقافتی، لغوی، قومی اور عالمی حیثیت حاصل ہے ، کیفیت و کمیت ہر دو لحاظ سے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسری سامی زبان کے حصے میں نہیں آیا اور یہی صورت حال خط عربی کی بھی ہے - اس سلسلے میں دائرۃ المعارف البریطانیہ کا بیان بڑا واضح اور جامع ہے :

"Arabic Language, one of the Semitic-languages (q.v) is spoken (1960 s) by 100,000,000 people in a large area including the Arabian-Peninsula, the Fertile Crescent and North Africa. In addition, as the language of the Koran and prayers of Islam it is important as a religious language throughout the Muslim World, and it has served as the vehicle of a vast literature (see Arabic Literature) extending from before the time of Mohammad up to the present day. It is customarily written in its own distinctive alphabet (q. v) which has also spread with Islam and is used for writing several other languages of the Islamic World. Thus in terms of the number of speakers and extent of its influence, Arabic is by for the most important

---

1. Gibb, H.A.R., Arabic Literature, p. 6

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Semitic language today and must be regarded as one of the important world-languages."[1]

لغات سامیة میں عربی زبان کے اس منفرد و جامع مقام کے اثبات کے بعد یہ رائے بھی بڑی وزنی ہے کہ عربی زبان اصل سامی زبانوں کے انتہائی قدیم عناصر پر مشتمل ہے اور اس لحاظ سے بھی سامی زبانوں کی مؤثر اور اہم تر نمائندہ زبان ہے :

"و من ممیزات اللغة العربیة ـ کما نوهنا بذلک فی الباب الاول انها تشمل علی عناصر قدیمة جداً من اللغات السامیة الاصلیة و هذا یدل علی ان اللغة العربیة کانت موجودة فی مهد اللغات السامیة او فی ناحیة قریبة منه او ان العناصر التی نزحت الی بلاد العرب کانت من اقدم الامم السامیة"۔ ۲

ترجمہ : عربی زبان کی خصوصیات میں سے جیسا کہ ہم نے باب اول میں واضح کیا ایک یہ ہے کہ وہ اصل سامی زبانوں کے انتہائی قدیم عناصر پر مشتمل ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عربی زبان سامی زبانوں کے وطن اصلی میں موجود تھی یا اس سے قریب کے کسی علاقے میں یا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عناصر جو بلاد عرب کی جانب آئے ، قدیم ترین سامی اقوام میں سے تھے ۔

عربی لسان کی معیاری اور مشترک صورت وہی ہے جیسے "اللغة العربیة الفصحی" یا "اللسان العربی المبین" کہا جاتا ہے اور جس میں قرآن مجید نازل ہوا ۔

"و انه لتنزیل رب العلمین نزل به الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین ۔" ۳

ترجمہ : اور بے شک یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے جسے روح امین نے آپ کے قلب پر صاف فصیح عربی زبان میں اتارا ہے تا کہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں ۔

یہ علمی و ادبی لسان مشترک قبل از اسلام عصر جاہلی میں اپنے مراحل ارتقاء و تکمیل سے گزر چکی تھی اور نزول قرآن نے اس کی عظمت و اہمیت کو اوج کمال تک پہنچا دیا :

---

1. Encyclopedia Britanica, I/182 (Arabic language)

۲- اسرائیل ولفنسون ، تاریخ اللغات السامیة ، ص ۱۶۸

۳- القرآن (الشعراء : ۱۹۲ - ۱۹۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"لما جاء الاسلام كانت اللغة العربية مزدهرة مكتملة النمو تنتظم كل أنحاء شبه الجزيرة العربية ، و تصطنع فی آداب یعتزبها أهلها ، و یتنافسون فی اتقانها و اجادتها ۔"[1]

ترجمہ: جب اسلام آیا تو عربی زبان روشن و منور تھی اور اس کا ارتقاء مکمل ہو چکا تھا ۔ یہ زبان شبہ جزیرۃ العرب کے تمام اطراف و جوانب کی تنظیم کا باعث تھی اور ایسے علوم کی صانع تھی جو اپنے حاملین کے لیے باعث عزت و شرف تھے اور اس میں مہارت و عمدگی پیدا کرنے کے لیے وہ لوگ آپس میں مقابلہ کرتے تھے ۔

یہ فصیح ادبی زبان شعر و خطابت اور اسواق و مواسم وغیرہ میں بھی اساسی اہمیت کی حامل تھی اور عربوں کے مابین لسان مشترک کی حیثیت رکھتی تھی ، جس پر انہیں اجتماعی لحاظ سے بڑا ناز تھا ۔ اسی لغۃ فصحی میں قرآن نازل ہوا اور اس زبان کو حیات ابدیہ عطا کرنے کا باعث بنا :

"و کانت هذه اللغة الأدبية بمثابة لغة مشتركة بين العرب جميعاً يتخذونها اداة التعبير عن آدابهم ، و يعتزون بها كل الاعتزاز ، و لهذا نزل القرآن الكريم بها ، فلم تكن لغة قريش وحدها او لغة مكة وحدها بل كانت اللغة المشتركة للعرب جميعاً غير أن نزول القرآن بها قد زادها ازدهاراً فوق ازدهار ، و ثبت اركانها و دعائمها ۔"[2]

ترجمہ: یہ ادبی زبان تمام عربوں کے مابین لسان مشترک کے مانند تھی جسے وہ اپنے علوم و آداب کے اظہار کا ذریعہ بناتے تھے اور جس کی بدولت وہ بڑے عزت و شرف کے حامل تھے ۔ اسی بناء پر قرآن کریم اس زبان میں نازل ہوا پس وہ صرف قریش یا صرف مکہ کی زبان نہ تھی، بلکہ اس کی حیثیت تمام عربوں کے لیے لسان مشترک کی تھی ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس فصیح زبان میں نزول قرآن نے اسے بے مثال رونق و عظمت بخشی اور اس کے ارکان اور بنیادیں پختگی سے استوار کر دیں ۔

"لغۃ القرآن" یا "اللغۃ الفصحی" کے ساتھ ساتھ اس جانب اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ مختلف لہجات عربوں میں ہر دور میں موجود رہے ہیں اور لغات سامیۃ کے مجموعی مطالعہ نیز عربی زبان کے تاریخی و عمومی مطالعہ کے سلسلے میں ان کا علمی جائزہ بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ بقول ڈاکٹر علم الدین الجندی :

١۔ الدکتور ابراہیم انیس ، اللغة بين القومية والعالمية ، ص ٢٧٥

٢۔ ایضاً ، ص ٢٧٦

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''دراسة اللهجات مبحث جديد من مباحث علم اللغة العام و هي الخطوة الأولى التي تسبق غيرها اذ ان دراسة لغة دراسة تاريخية لا يتم الا بعد الانتهاء من بحث لهجاتها''۔[1]

ترجمہ: لہجوں اور بولیوں کا مطالعہ علم لسان کے عمومی مباحث میں سے ایک جدید تحقیقی پہلو ہے اور اسے پہلے قدم کے طور پر بقیہ پہلوؤں پر سبقت حاصل ہے کیونکہ کسی زبان کا تاریخی مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لہجوں اور بولیوں کے بارے میں تحقیق مکمل نہ کر لی جائے۔

کسی تفصیلی اور مستقل بالذات بحث میں پڑے بغیر غلط فہمی کے ازالہ کے لیے بطور اشارہ اتنا کہنا نا گزیر ہے کہ مختلف قومی و مقامی لہجے اپنی اہمیت کے باوجود مطالعہ السنۃ سامیۃ اور لسان عربی پر دو حوالوں سے ثانوی حیثیت کے حامل ہیں۔ اساسی و دائمی اہمیت صرف ''اللغۃ الفصحی'' کو حاصل ہے۔ اس سلسلے میں دکتور حسنی محمود نے اپنے مقالہ ''اللهجات العامية لما ذا ؟ و الى أين ؟'' مطبوعہ ''مجلة اللسان العربی'' میں بڑی متوازن رائے دی ہے:

''و واقع اللهجات العامية و طبيعتها حقيقة لا نستطيع ان نفر منها ، و انما يجب أن نواجهها في شجاعة ، و ان نفكر كيف نقرب بينها مادام أهلوها جميعاً ينطقون لغة واحدة هي اللغة الفصحى التي انشعبت عنها و تفرعت هذه اللهجات ۔''[2]

ترجمہ: عوامی بولیوں کا عملی وجود اور ان کی نوعیت و طبیعت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے فرار ہمارے لیے ممکن نہیں، بلکہ لازم ہے کہ ہم ان کا جرأت کے ساتھ سامنا کریں اور اس بات پر غور کرتے رہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے قریب کس طرح لایا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک جب تک ان لہجوں اور بولیوں کے بولنے والے تمام لوگ ایک مشترکہ فصیح زبان استعمال کرتے رہیں گے، وہ فصیح زبان جس میں سے یہ بولیاں نکلیں اور برآمد ہوئی ہیں۔

چنانچہ لغات سامیہ کے تحقیقی مطالعہ سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

(۱) لغات سامیہ وہ زبانیں ہیں جو ایشیا و افریقہ کے مختلف علاقوں میں مقیم سام بن نوحؑ کی اولاد بولتی تھی، خواہ وہ زبانیں اب مردہ ہیں یا ابھی تک

۱۔ الدکتور احمد علم الدين الجندی ، اللهجات العربية فی التراث ، ج ۱ ، ص ۹

۲۔ راجع مجلة ''اللسان العربی'' الرباط ، عدد ۲۰ ، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء ، ص ۳۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندہ زبانوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان زبانوں میں بابلی، اشوری، فینیقی، اکادی، عبرانی، سریانی، حبشی اور عربی وغیرہ شامل ہیں۔ ان زبانوں کو ''لغات سامیۃ'' کا نام جرمن مؤرخ اے۔ ابل۔ شلوذر نے ۱۷۸۱ء میں اس وقت دیا جب وہ امم ماضیۃ کے سلسلے میں ابحاث و تحقیقات کر رہے تھے۔

(۲) لغات سامیۃ کے مابین پائے جانے والے گہرے تعلق اور مشابہت کو سب سے پہلے قرون وسطی میں اندلس کے یہودی علماء نے محسوس کیا اور پھر عصر جدید میں مستشرقین نے اس حقیقت کو علمی اور مدلل انداز میں ثابت کر دیا۔

۳۔ لغات سامیہ کی بنیاد سامیہ اصلیہ ہے جو ایک متحدہ یا مجموعہ لہجات زبان کی حیثیت سے تمام امم سامیہ کے مہد اصلی یا وطن اول میں بولی جاتی تھی۔ پھر اس وطن اصلی سے مختلف وجوہات کی بناء پر سامی گروہ نکل کر دیگر علاقوں میں منتشر ہوگئے۔ اس مہد اصلی کا واضح اور یقینی تعین انتہائی مشکل کام ہے۔ جزیرۃ العرب، عراق، کردستان، سوریہ، فلسطین، حبشہ، مصر اور شمالی افریقہ وغیرہ میں ان زبانوں کے بولنے والے مختلف اوقات میں پھیلے اور امم سامیہ کے وطن اول کے سلسلے میں ایشیا و افریقہ کے مختلف علاقے زیر بحث آتے رہے ہیں۔ تاہم یہودی، مسیحی اور مسلم علماء و مستشرقین کی واضح تعداد دلائل کے ساتھ اس کی تائید کرتی ہے کہ جزیرۃ العرب ہی کے وطن اول ہونے کا غالب تر امکان ہے۔

۴۔ مہد اصلی سے رابطہ منقطع ہو جانے، مقامی ماحول کے اثرات اور مرور زمانہ جیسے اسباب کی بناء پر مختلف علاقوں میں منتشر امم سامیۃ کی زبانیں مختلف اور مستقل بالذات ہوگئیں۔ تاہم ان کے مابین اب تک گہری مشابہت اور خصائص مشترکہ موجود ہیں جو ان کی اصل مشترک کی واضح نشاندہی کرتے ہیں۔

۵۔ عربی اور عبرانی زبانیں لغات سامیۃ میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں اور اب تک زندہ زبانیں ہیں۔ تاہم اہل علم و تحقیق کی رائے میں عربی وہ اہم ترین سامی زبان ہے جو اپنے عناصر لغویہ کے لحاظ سے سامیہ اصلیہ سے قریب تر اور اس کی جامع تر ممکنہ نمائندہ ہے اور سامی تحقیقات کے لیے اہم ترین وسیلہ ہے۔ عبرانی بھی صدیوں تک مردہ زبان رہی ہے اور اب ایک محدود علاقے میں اسے انتھک اور مسلسل جد و جہد کے ذریعے زندگی بخشی گئی ہے۔ تاہم عربی وہ واحد سامی زبان ہے جو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے زوال و انحطاط کے تمام ادوار کے باوجود مسلسل زندہ ہے اور دینی، علمی، قومی، مقامی، عالمی اور دیگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوالوں سے دنیا کی اہم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے ۔

۶۔ عربی زبان کی بقاء و حفاظت ، مختلف لہجات کو باہم قریب تر اور متحد کرنے ، نیز عربی کی ہمہ جہتی و عالمگیر توسیع میں قرآن و اسلام نے بنیادی اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے ۔ اس اہم ترین سامی زبان کی اعلیٰ ترین اور مستقل معیاری شکل وہ ''اللغة الفصحی'' یا ''لسان عربی مبین'' ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا اور جو نزول قرآن سے پہلے شعر و ادب کی لسان مشترک تھی ۔ تاہم عربی زبان کی قومی اور مقامی بولیاں یا لہجات عامیة بھی ہر دور میں موجود رہے ہیں اور لغوی تحقیقات کے لیے ان کی تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ۔ اگرچہ ''اللغة الفصحیٰ'' کے مقابلے میں ان کی حیثیت انتہائی ثانوی ہے اور وہی ان سب کی اساس و بنیاد ہے ۔ نیز ان مختلف لہجات کو باہم اور ''اللغة الفصحی'' سے قریب تر لانے کا عمل صدیوں سے جاری ہے اور عصر جدید میں ''اللغة الفصحی'' کے عالمی ، قومی ، تعلیمی ، علمی ، ثقافتی اور دینی سطح پر وسیع تر فروغ نے لہجات عامیة کی اہمیت مزید کم کر دی ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ عصر جدید کی علمی تحقیقات نے لغات سامیہ کے حوالے سے عربی زبان کی اساسی اور انتہائی اہمیت واضح تر کر دی ہے ۔

فهرس المراجع

۱۔ القرآن الكريم

۲۔ الدكتور ابراهيم أنيس : اللغة بين القومية و العالمية ، مصر : دارالمعارف ، ۱۹۷۰م

۳۔ احمد حسن الزيات : تاريخ الادب العربى ، القاهرة : مطبعة الرسالة ، ۱۹۵۵م

۴۔ الدكتور احمد علم الدين الجندى : اللهجات العربية فى التراث ، ليبيا ، تونس : الدار العربية للكتاب ، ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء

۵۔ اسرائيل ولفنسون : تاريخ اللغات السامية ، مصر : مطبعة الاعتماد ، ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹م

۶۔ جرجى زيدان : تاريخ آداب اللغة العربية ، بيروت : دار مكتبة الحياة ، ۱۹۶۷م

۷۔ مجلة اللسان العربى ، الرباط العدد ۲۰ ، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳م ، الدار البيضاء : مطبعة النجاح الجديدة ۔ (المنظمة العربية للتربية و الثقافة و العلوم ، مكتب تنسيق التعريب)

8. Gibb, H.A.R : Arabic Literature, London : Oxford Press, 1963

© rasailojaraid.com